سے اپنے چہرے پر آنسوؤں کی گذرگاہوں کو دیکھا اور تشویش سے دیکھا "بھلا یہ
ہے —"

چوہدری اللہ داد ایک سیلف میڈ شخص تھا۔ اور اس کے باوجود وہ دھیما
طبیعت کا تھا.... وہ دراز قد ہونے کے باوجود ہمیشہ سر جھکا کر چلتا تھا اور اُس کے جا
کھانس کر اُسے اپنی جانب متوجہ کرتے اور پھر سلام کرتے — ورنہ وہ پاس سے گز
— اُس کی نرم دلی اُس کی بیوی کے لیے ایک آزار تھی۔ اگر اُس نے سٹیشن
فٹ پاتھ پر کسی بوڑھے کو لیٹا ہوا دیکھ لیا ہے تو وہ اذیت میں مبتلا ہو جائے گا۔
بوڑھے نے کھانا کھایا ہے؟ پتہ نہیں رات گذارنے کے لیے اُس کے پاس کوئی گرم
یا نہیں؟ کہیں وہ بیمار تو نہیں — وہ بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہتا اور اُس کی بیوی
کہ آج پھر کوئی بوڑھا ہے، کوئی بچہ ہے کوئی معذور ہے جو اسے سونے نہیں دے
آواز دے کر اُسے متوجہ کرتی "میں نے کہا آپ اُٹھیں اور پتہ کر آئیں" کیونکہ
جانتی تھی کہ جب تک وہ جا کر پتہ نہیں کرے گا اُس کی تسلی نہیں ہو گی۔ اگر
آرام سے ہے تو وہ سرہلاتا آئے گا اور فوراً سو جائے گا.... اُس نے اپنے لیے کچھ
تھا، ایک اچھی ملازمت کے باوجود کوئی جائداد نہیں بنائی تھی۔۔ اُس کی جیب میں
دیر نہیں ٹھہرتی تھی۔ اُس کی بیوی اگر دھیان نہ رکھتی تو گھریلو استعمال کی اشیاء
میں غائب ہو جاتیں —

جو لوگ اپنے زورِ بازو سے شدید جدوجہد کے بعد اپنے طبقے سے نکلتے ہیں
مقام حاصل کرتے ہیں وہ عام طور پر انسانی ہمدردی سے دور ہو جاتے ہیں۔ بہت
کے اور بدلہ لینے والے ہو جاتے ہیں۔ اگر معاشرے نے اُن کے ساتھ کوئی رعایت
تو وہ اب معاشرے کے ساتھ کوئی رعایت کیوں کریں — ایسے لوگ اپنے بچوں
زندگی سے بھی حسد کرتے ہیں — میں جب چھوٹا تھا تو دس میل پیدل چل کر
تھا — میں جب چھوٹا تھا تو میرے پاس جوتے نہیں ہوتے تھے، میں چٹنی کے سا
کھاتا تھا — اور میں جب چھوٹا تھا تو.... وہ اپنی اولاد کو بھی آسائش میں نہیں دیکھ
وہ ہمہ وقت بدلہ لینے کی فکر میں ہوتے ہیں، اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر ثابت
فکر میں ہوتے ہیں اور — یوں بطور انسان ضائع ہو جاتے ہیں — اللہ داد نے
پہنچنے کے لیے بہت مشقت کی تھی، بہت ناروا دُکھ سہے تھے اور فاقے کیے تھے

میں کہیں وہ کسی پارس سے کسی خیال سے چھُو گیا تھا اور نرم ہو گیا تھا — عجیب بات یہ تھی کہ اُس کے ذہن میں گناہ اور ثواب کا کوئی مذہبی تصور موجود نہ تھا۔ وہ اپنے ثوابوں کو اُنگلیوں پر گن کر جنت میں اپنے درجوں کا حساب نہیں لگاتا تھا —

"اوہ تیرا بھلا ہو جائے —" اُنہوں نے ایک مرتبہ پھر کہا۔

"ابّا جی آپ ہمیشہ کہتے ہیں کہ جس چیز کی سمجھ نہ آئے وہ پوچھ لیا کرو — تو یہ میری سمجھ میں نہیں آرہا — سب کہتے ہیں کہ بُندو رام ہندو تھا وہ دوزخ میں جائے گا — پر ابا جی وہ تو گلی میں بیٹھ کر حقہ پیتا تھا اُس نے کبھی کسی کو کچھ نہیں کہا تو وہ کیوں دوزخ میں جائے گا —"

"بیٹے کیا پتہ کیا ہونا ہے —"

"اور ابّا جی وہ شاہ جی جو تھانیدار تھے — وہ روزہ رکھ کر لُوٹ مار کروا رہے تھے ابّا جی... وہ... سب لوگ کہتے ہیں وہ جنت میں جائیں گے — کیوں؟"

"سب لوگ جو کہتے ہیں وہ ہمیشہ سچ نہیں ہوتا۔"

"اور ابّا جی ہمارے مولوی صاحب کہتے ہیں کہ سب کے سب کافر جہنم میں جل جائیں گے تو میں نے پوچھا کہ یہ جو پتہ نہیں کتنے ارب چینی ہیں تو یہ بھی سارے کے سارے جہنم میں جائیں گے تو مولوی صاحب نے کہا، بالکل — تو میں نے کہا مولوی صاحب اتنے سارے چینیوں نے کیا قصور کیا ہے — یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ سب جہنم میں ڈال دیئے جائیں — جہنم میں تو اتنی جگہ نہیں ہو گی.. اس پر ابا جی پتہ ہے مولوی صاحب نے مجھے کیا کہا؟ اُنہوں نے چار بید مارے اور کہنے لگے تو خبیث ہے... ابا جی یہ خبیث کیا ہوتا ہے؟"

چوہدری اللہ داد نے بیٹے کے گال تھپکے اور خوش ہو کر کہا "اوہ تیرا بھلا ہو جائے"

نواڑی پلنگ کے رانگلے پایوں کے درمیان جٹی سفید نواڑ پر وہ دونوں کچھ کھسکتے تھے ان رکابیوں کو بمشکل سنبھالتے تھے جو ایک ٹھیکے ہوئے دسترخوان پر ڈولتی تھیں۔ اُنہیں ڈھیلی نواڑ والے پلنگ پر بیٹھنے کا بلکہ بیٹھ کر اپنے آپ کو کھسکنے سے بچانے کا کوئی تجربہ تھا — اور اس دوران اُنہیں موٹی تنوری روٹی سے نوالہ توڑ کر رکابی میں سے پیاز اور دال کے سالن کو انگوٹھے کی مدد سے نوالے کے ساتھ لگا کر منہ تک لے جانا تھا۔

مشاہد نے پہلا نوالا منہ میں ڈالا اور دو چار بار منہ چلانے کے بعد رُک گیا۔
نے مردان کی طرف دیکھا — اُس کے منہ اور ٹھوڑی پر گھی کی چربیلی چمک تھی او
ہلاتا ہوا روٹی اور سالن سے خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔

چاچی رابیاں کا جھالروں والی پنکھی والا ہاتھ آہستہ ہوا اور پھر رُک گ
صدقے، کھاتے کیوں نہیں؟"

"چاچی جی — وہ —"

"ہماری زمین نہیں ہے بیلے کے مُنہ کے قریب — ادھر جو کھیت ہے
کنک کی روٹی ہے پُتر... ایسا زور ہے اُس زمین کے ٹوٹے میں کہ ہم تو سُوکھی کھا
گھیو والی کا سواد آ جاتا ہے — سالن میں جو گھیو ڈالا ہے وہ بھی اُس بھینس کا ہے
سینگ کمانیں بناتے ہوئے گلے کے نیچے آ کر ملتے ہیں — اور آنڈے بھی گھر کے
— کھاتا کیوں نہیں؟"

"اس میں — چاچی مجھے اس میں سے بُو آتی ہے —"

"مجھے پتہ ہے تمہیں کس شے کی بُو آتی ہے، مجھے پتہ ہے۔" چاچی ہنس
ہوئی اور پھر بہت ہنسی "تمہیں دراصل دیسی گھیو کی مُشک آتی ہے — شہریئے جو
ماں رَجھ گئی بُرکی تو منہ میں ڈالو آپو آپ گلے سے اُترتی جائے گی — شاباشے کھاؤ

مشاہد کا جبڑا ہلنے لگا — لیکن بُو موجود تھی — سڑاند تھی — جیسے چٹیل
میں کوئی مُردار تیز دُھوپ میں پڑا ہو۔

وہ اسے نگل نہیں سکتا تھا۔

چھوٹا مردان سر ہلاتا پچاکے مارتا مزے سے کھانا کھا رہا تھا۔

آپا جی کی لاہور سے یہاں تک کے سفر کی تھکاوٹ ابھی ختم نہیں ہوئی تھ
سر کو دوپٹے سے باندھے کنک کے بھڑولوں والی نیم تاریک کوٹھڑی میں ایک
چارپائی پر لیٹی زور زور سے خراٹے لے رہی تھیں۔ مستقبل کی دونوں "باجیاں"
دائیں بائیں اُن کے جُثے سے لپٹی سو رہی تھیں۔

ابا جی انہیں گاؤں چھوڑ کر واپس لاہور جا چکے تھے۔

لاہور مختلف افواہوں کی زد میں تھا —

گورکھا فوج شہر کے مختلف حصوں میں طاقتور بم چھپا کر گئی ہے جو کسی خا

سارے کے سارے چل جائیں گے اور پورا لاہور شاہ عالمی کے ملبے کی طرح ہو جائے گا۔

نہرو کو لاہور کا بڑا غم ہے اور وہ سکھوں کی مدد سے اس پر حملہ کر دے گا ـــــ

پناہ گیر طرح طرح کی بیماریاں لے کر آئے ہیں اور طاعون پھیلنے والی ہے۔

چوہدری اللہ داد کا ذہن ان افواہوں کو قبول نہیں کرتا تھا لیکن وہ اپنے بال بچوں کی جانب دیکھتا تو بے چین سا محسوس کرتا ـــــ انہیں کسی محفوظ جگہ پر ہونا چاہئے ـــــ اپنے گاؤں میں ـــــ اپنے کچے آبائی مکان میں۔ ٹھیک ہے انہیں عادت نہیں ہے لیکن چند روز گذارہ کر لیں گے ـــــ یوں بھی اُن کی غیر موجودگی میں وہ دلجمعی سے رفیوجی کیمپوں میں اپنے آپ کو مصروف رکھ سکتا تھا۔

گاؤں جانے کے لیے ایک خاص منصوبہ بندی کرنی پڑتی تھی ـــــ گجرات تک کے لیے ٹرین کے ٹکٹوں کا حصول، ستارہ کوٹ کے خیردین تانگے والے کو پیشگی اطلاع کہ فلاں تاریخ کو چوہدری صاحب کا خاندان صبح سویرے ریلوے سٹیشن کے باہر تمہارا انتظار کرے گا۔ گاؤں کے رشتے داروں کو اطلاع کہ گھر کی صفائی کروا دیں اور چولہے اور بستروں کا بندوبست کر دیں اور لالٹین کے شیشے بھی چمکا دیں۔

وہ فجر کے فوراً بعد لاہور سے نکلتے اور ابھی سردیوں کی صبح میں دُھند گجرات کے سٹیشن پر ٹھہری ہوتی کہ اُن کی ٹرین بھاری لوہے کی گہری گڑگڑاہٹ کے ساتھ شیڈ کے اندر داخل ہو جاتی...

اس مرتبہ اُن کی ٹرین بہت دیر میں، تقریباً دوپہر کے وقت گجرات پہنچی اور اس کی ایک وجہ تھی۔

گجرات سے چناب کے کنارے واقع سرسبز اور دریا کی خنکی والے کچے گھروندوں
ں کا تانگے کا سفر ہمیشہ ایڈونچرس ثابت ہوتا۔ راستے میں غنیمت کنجاہی کا قصبہ کنجاہ بھی
تا اور اُس کی قبر کچی سڑک سے دکھائی دے جاتی۔ سکندر اعظم کے گھوڑے کا مدفن پھالیہ
ا اسی راہ میں تھا لیکن اصل ایڈونچر بھمبر نالے کی خشک گذرگاہ میں سے خیردین کے
یلے تانگے اور ناتواں گھوڑے کا خیر خیریت سے گذر جانا ہوتا تھا۔ چوہدری صاحب کا
ران بھمبر کی ریت میں سے پاؤں کوشش سے نکال نکال کر چلتے اور دعا کرتے کہ اس
ت میں زور لگاتے گھوڑے کا "وَدّھر" نہ ٹوٹ جائے۔ اگر یہ وَدّھر ٹوٹ جاتا تو آپا جی
یک ترین کیکر کے نیچے اپنے بچوں کو سمیٹ کر بیٹھ جاتیں اور پراٹھوں انڈوں والا

دسترخوان کھول کر زمین پر بچھا دیتیں۔ کوئی بھی دیہاتی عورت سر پر بھتہ اُٹھائے آ
میں کے ریڈئس میں سے گذرتی تو آپا جی اُسے "نیں بہن ادھر تو آ —" کی آواز
کر پاس بلاتیں اور پھر اُس کی لسّی کی چاٹی سر سے اُتروا کر سامنے رکھتیں اور اطمینان
بچوں کو پلانے لگتیں... چاٹی خالی ہوتی تو آپا جی اپنے ہاتھوں سے پھر اُس کے سر پر ر
اور کہتیں "لے بہن... تیری مہربانی" — اور ہمیشہ جواب میں اُس عورت نے یہی
— لے مہربانی کس بات کی —

اس دوران خیردین گھوڑے کو تانگے سے الگ کر کے کسی درخت کے
باندھتا اور اُس کے کمزور بدن کے ساتھ بندھی ہوئی زین اور ساز وغیرہ کھول کر کند
ڈالتا اور کسی موچی کی تلاش میں نکل جاتا — تاکہ ودھر کی مرمت ہو سکے —
جب بھی اس کام کے لیے گیا تو اُس نے یہ جانا کہ شتابی کا کام شیطان کا ہوتا ہے
بہت سمجے سے شام تک واپس آتا اور کیکر کے نیچے اونگھتے ہوئے مردان اور مشاہد
دیتا "باؤ جی — گاؤں نہیں چلنا؟"

وہ دریا کی سطح پر سے ٹھنڈی ہونے والی ہوا اور تاروں کی چھاؤں میں گاؤ
اور گھوڑے کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی چھَن چھَن سے گلیوں میں پھرنے وا
کے کان کھڑے ہو جاتے اور وہ ایک آدھ مرتبہ ضرور بھونکتے۔

پہلے دن کا کھانا چاچی رابیاں کی طرف ہوتا —

نہیں اس کھانے میں ایک سڑاند تھی جیسے مردار دھوپ میں بُو دیتا ہے —

دھوپ کچھ ڈھلی تو چاچا محمد بخش ان دونوں کو "ہلکی" پر نہلانے کے لیے
جہاں سے درختوں کا جنگل بیلا شروع ہوتا تھا وہیں سے دریا میں سے ایک چھوٹی
نکلتی تھی جو کھیتوں اور کچھ ویران ٹیلوں میں سے گذرتی دو تین میل نیچے جا کر در
شامل ہو جاتی تھی۔ یہ ندی تیز بہت تھی اور چنگے گھبرو جوانوں کے پاؤں بھی اکھاڑ
پانی بھی ڈوبو نہیں تھا صرف کمر تک آتا تھا لیکن اسے عبور کرنے کے لیے بہت
زور درکار ہوتا تھا۔ یہ ندی بہت ٹھنڈی ٹھار تھی اور گرمیوں کی شکر دوپہروں میں
میں ایک ڈبکی لگانے کے بعد بدن کی کپکپی دُور کرنے کے لیے کنارے کی گرم ر
پڑتا تھا —

یہ ہر برس ایک دو بچوں یا کئی بار بڑوں کو بھی بہا لے جاتی اس لیے ا

پاگل کتیا کا نام دیا گیا تھا۔

جو سکھ اور ہندو جو کالیاں چھوڑ کر گئے وہ زندگی کے آخری دموں تک لکھنؤ اور دہلی ایسے شہروں میں بھی "ہلکی" کی خنکی اور تازگی کو یاد کر کے روتے تھے۔

"ہلکی" کے راستے میں قبریں تھیں۔

مردان چونکہ کھانے کے بعد سو گیا تھا اور اُسے زبردستی جگا کر ساتھ لایا گیا تھا اس لیے اُس کی آنکھیں ابھی تک سرخ تھیں اور وہ ایک ناگوار شکل بنائے بیزاری سے چلتا رہا۔

اُس نے پیچھے دیکھا اور پھر رُک کر مردان کا انتظار کیا۔ چاچا محمد بخش آگے جا چکا تھا۔

"مردان ——" جب وہ قریب آیا تو مشاہد بولا "تمہیں پتہ ہے کہ ہمارے دادا جی کی قبر ادھر ہے —— ان قبروں میں؟"

مردان کو دادا جی کی قبر میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اُس کی آنکھیں نیند سے بھری ہوئی تھیں۔

"میں بہت چھوٹا تھا جب دادا جی مر گئے تھے ——" مشاہد نے بہت بُردباری اور دانش مندی سے سر ہلایا اور اپنے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا جو مشکل سے چلنے کے قابل ہوا تھا —— اُس کے دیکھنے کی دیر تھی کہ مردان نے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا دیئے یعنی میں تھک گیا ہوں مجھے اُٹھا لو ——

"نہیں ابھی نہیں۔"

مردان نے مُنہ بسورا اور رونے کا بندوبست کرنے لگا۔

"اچھا بابا۔ ادھر آؤ" مشاہد کو اُسے اُٹھانے کے لیے زور لگانا پڑا کیونکہ مردان بہت تازہ اور وزنی بچہ تھا۔ اُٹھانے کے بعد اُس نے اپنے آپ کو ذرا جُھلایا تاکہ اس وزن کو ساتھ سٹارٹ لے سکے اور پھر ہولے ہولے چلنے لگا۔

"ہاں تو —— میں بہت چھوٹا تھا جب دادا جی مر گئے تھے ——"

اب مردان کو دادا جی کے مرنے کی داستان سننے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔

"ابّا جی کو خبر کرنے کے لیے گاؤں سے ایک میراثی گیا تھا۔ اور وہ بہت روئے تھے۔ دادا جی کو اُٹھا کر ادھر لائے تھے تو میں ابّا جی کی اُنگلی تھامے اُن کے ساتھ ساتھ چلتا تھا

اور اوپر اُن کی طرف دیکھتا تھا اور وہ روتے تھے۔ اُن کے دوسرے ہاتھ میں چھڑی ٹیک ٹیک کر وہ چلتے تھے۔ تمہیں تو پتہ بھی نہیں ہو گا کیونکہ تم ابھی تھے ہی نہیں پتہ نہیں کہاں تھے —"

چاچا محمد بخش سروٹوں کی چھاؤں میں بیٹھا اُن کا انتظار کر رہا تھا "اوئے اس کو تم نے کیسے اُٹھایا ہوا ہے۔ تم تو خود چھوٹے ہو۔ لاؤ اسے مجھے دے دو۔"

مردان چاچا محمد بخش کے ہاتھوں میں بخوشی منتقل ہو گیا۔

"چاچا جی — ادھر میرے دادا جی کی قبر کونسی ہے؟"

"ہیں؟" چاچے کو اس سوال کی توقع نہ تھی۔ "بھائی کی قبر — بس ادھر — شائد وہ ہے جس پر کسی نے مٹی ڈالی ہوئی ہے — میں آیا تھا محرموں میں، کر گیا تھا پر اب کچھ دماغ کمزور ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے یہی ہے — ویسے بھائی اللہ پتہ ہے..."

"اُن کو تو پتہ ہو گا۔ اُن کے ابا جی کی جو ہے —"

"شاباشے —" چاچا محمد بخش نے سر ہلایا "دماغ تو بڑا ہو جاتا ہے ناں شہر میں کے —"

سورج نیچے ہو چکا تھا اور جہاں جہاں سے "ہلکی" گذرتی تھی وہاں اُس کی ہ کو روشن ایسے کرتا تھا کہ دیکھنے سے آنکھیں چندھیاتی تھیں۔ چاچے نے پہلے م مضبوطی سے پکڑ کر پانی میں ایک مناسب وقفے کا غوطہ دیا اور جب اُسے باہر نکالا تو کے لیے پانی بھرے منہ کو کھولے "ہپ ہپ" کرتا تھا۔ اُس کا رنگ نیلا پڑ گیا تھا۔

مشاہد کے چہرے پر فکرمندی آئی — اپنے بھائی کے لیے —

"ابھی ٹھیک ہو جائے گا —" چاچے نے اُس کی کمر پر دو چار دھپے رسید اُس کا سانس چل نکلا۔ اب اُسے سردی لگنے لگی۔

"چل تجھے بھی ایک غوطہ لگواؤں؟"

"نہیں جی — چاچا جی آپ میرا ہاتھ پکڑیں میں خود لگاتا ہوں جی —"

وہ چاچے کا ہاتھ تھامے پانی میں اُترا اور اُس کی ٹھنڈک اور تازگی نے اُ اُسکے بدن کو خوش کر دیا۔ صرف چند لمحوں میں پانی کی یہ ٹھنڈک ناقابل برداشت اور وہ باہر آ کر ریت پر بیٹھ گیا —

یہاں بھی ایک بُو تھی۔ سڑاند تھی۔ شائد آس پاس کوئی جانور مرا پڑا تھا۔ وہاں بھی یہی بُو تھی — وہاں کامونکی سٹیشن پر —

اُن کی ٹرین لاہور سے چلی تو بہت دیر سے گجرات پہنچی تھی — اور اس کی ایک وجہ تھی۔

ٹرین رُک گئی۔

"کونسا سٹیشن ہے؟" آپا جی نے پوچھا تھا۔

ابّا جی اپنے اخبار میں مگن تھے، انہوں نے سر اُٹھا کر "پتہ نہیں" کہا اور پھر سر جھکا لیا۔

"پتہ نہیں تو پتہ کریں ناں —" آپا جی نے ذرا سخت لہجے میں کہا کیونکہ وہ ابّا جی کو خاصا لاپرواہ سمجھتی تھیں۔

ابّا جی نے اُن کے لہجے کی سختی کا بُرا نہیں مانا اور اخبار سمیٹ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے "میرا خیال ہے کامونکی ہے — پر ادھر تو سٹاپ نہیں ہے، رُک کیوں گئی ہے — شائد کراس ہے" وہ پھر اخبار پر جھکنے کو تھے کہ آپا جی ذرا اور سخت لہجے میں آ گئیں شائد کراس ہے — نیچے اُتر کر پتہ نہیں کرتے گارڈ سے کہ کیا معاملہ ہے — ٹرینوں کے ساتھ جانتے ہو ناں کیا ہو رہا ہے آج کل — اور بچے ساتھ ہیں۔"

ابا جی نے آپا جی کی طرف دیکھا تو وہ اُنہیں گھور رہی تھیں۔ اُنہوں نے اخبار مشاہد کو تھمایا اور نیچے اُتر گئے۔ ٹرین پلیٹ فارم سے باہر کھڑی تھی اس لیے اُنہیں اترنے میں بھی دقت ہوئی۔ ڈبّے میں اُن کے علاوہ صرف دو عورتیں تھیں جو اپنی چادروں کو ٹھی تک کھینچ کر چُپ بیٹھی تھیں۔ آپا جی سیاہ برقعے میں تھیں۔

ابا جی واپس آئے تو ان کا رنگ نچڑا ہوا تھا۔

"کراس ہے؟"

"ہاں —" اُنہوں نے عجیب سی آواز میں جواب دیا اور پھر اخبار کھول لیا۔ مشاہد نے دیکھا کہ اخبار پر اُن کی اُنگلیاں گرفت نہیں کر رہی تھیں اور لرزتی ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ڈبّے آپس میں بھڑے اور ٹرین حرکت میں آ گئی۔ ابّا جی اخبار پر نظریں جمائے بیٹھے رہے۔ وہ سب کھڑکی میں سے باہر جھانکنے لگے۔

"باہر مت دیکھو۔" اباجی کی ایسی غصیلی اور گرجدار آواز انہوں نے پہلے کہ
نہیں سنی تھی۔

"کیوں پر — ؟" آپا جی نے پوچھا۔

"کیونکہ میں کہتا ہوں —"

آپا جی بھی ڈر گئیں اور کھڑکی سے منہ موڑ کر بیٹھ گئیں۔

ٹرین بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی —

مشاہد نے چوری چھپے باہر دیکھا۔ ٹرین کامونکی کے پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی۔ لیکن وہاں ایک اور ٹرین بھی تھی جو کھڑی تھی۔

آٹھ سالہ برکت یا بکّو جب کامونکی کے سب سے غلیظ اور گہرے جوہڑ میں ایک ڈبکی لگا کر باہر آیا تو اُس کے سیاہ بدن پر جوہڑ کی تہہ کی تمام تر غلاظت اور گارے کا رواں نیم سیاہ لیپ تھا۔ وہ چُوڑا ہونے کی وجہ سے یوں بھی کالا شاہ تھا لیکن گارے کے غلیظ لیپ نے اُس کی شخصیت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ اُس کے نتھنوں کانوں اور منہ سے گندگی ایسے دھیرے دھیرے باہر آ رہی تھی جیسے اس کی رگوں میں خون کی بجائے کامونکی کے جوہڑوں کا گارا گردش کرتا ہے۔ اُس نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کر دیا جس میں کا ایک کٹورا تھا اور اس میں سے بھی گارا گر رہا تھا۔

"ہاہائے پلیت کر دیا ہے ناں —" ماسی بہشت بی بی آگے آئی اور اس نے کے ایک ٹکڑے سے اُس کٹورے کو پکڑ لیا۔ "بکو ذرا پاک ہو کر شام کو آنا ہمارے میں تمہیں دو روٹیاں دوں گی۔"

برکت مسیح عرف بکّو کو "بکّو ساہ پکّا" بھی کہا جاتا تھا کیونکہ پانی کے نیچے دیر تک کے لیے اُس کا سانس بہت مضبوط تھا۔ وہ اپنے ماں باپ اور لاتعداد بہن بھائیوں کامونکی کی عیسائیوں کی ٹھٹّی میں رہتا تھا۔ وہ اگر ایک ہفتہ بھی اپنے کچّے کوٹھے سے رہتا تو اُس کی بے بے کو قطعی طور پر علم نہ ہوتا کہ اس کے بچوں میں سے ایک ہے۔ سب بچّے اپنی اپنی روٹی کے خود ذمہ دار تھے۔ بکّو کو اس کا پکا سانس روٹی د بڑے جوہڑ کے اردگرد جو مکان تھے اُن کے مکینوں کو اس کی ضرورت پڑتی رہتی تھی اکثر جوہڑ میں گھر کی چیزیں پھینک دیتے۔ کبھی کوئی برتن، کھیتی باڑی کا کوئی اوزار

ہوا سے کوٹھوں پر سوکھتے کپڑے بھی اُڑ کر جوہڑ میں چلے جاتے... ایک مرتبہ جوہڑ کے کنارے کپڑے دھوتے ہوئے چاچی مہراں نے گرمی کی شدت سے مجبور ہو کر ذرا آگے ہو کر ایک ڈبکی لگا لی تو اُس کی بالی پانی میں گر گئی — اسے بھی بکو نے تلاش کیا اور چاچی مہراں نے اسے انعام کے طور پر ایک پُرانا کھیس دیا تھا۔ اور ایک دن ایسا بھی آیا تھا جب کامونکی میں کوئی فرد ایسا نہ تھا جس کی نظریں اُس پر نہ تھیں اور وہ سب اُس کی جانب بڑی آس اُمید کے ساتھ دیکھتے تھے۔ ایک آٹھ سالہ چُوڑے ننگ دھڑنگ کالے سیاہ بچے کے لیے اس سے بڑا لمحہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ پورا قصبہ اُس کی طرف دیکھتا ہو اور اُمید بھری نظروں سے دیکھتا ہو۔ بارشوں کے مہینوں میں جوہڑ کا پانی گلیوں کے اندر تک آ جاتا تھا۔ قصبے کے بچے دو تین شہتیروں کو باندھ کر ایک تختہ بنا لیتے اور اُسے جوہڑ میں دھکیل کر چھلانگیں لگاتے ہوئے اُس پر سوار ہو جاتے۔ تختہ اپنی من مرضی سے جوہڑ میں تیرتا رہتا اور بچے اُس پر اُدھم مچاتے رہتے۔ ایک روز اُن کے ہمراہ بابُو بھی تھی — ایک نوجوان ہوتی بھرے بدن کی سفید رنگت اور سوہنے نین نقش کی لڑکی — وہ اپنے چاچے کے لیے لسّی لے کر جا رہی تھی جب بچوں نے اُسے روک کر تختے پر "ہُوٹا" لینے کو کہا.. وہ ڈرتی ڈرتی تختے پر چڑھ گئی — تختہ ہوا کے زور سے ڈولتا جوہڑ کے درمیان تک چلا گیا۔ اور پھر کوئی نہیں جانتا کہ کیسے اُلٹ گیا... سب بچے خوشی سے شور مچاتے تیرتے ہوئے کنارے تک آ گئے لیکن بابُو غائب تھی — وہ تختہ اُلٹتے ہی نیچے گئی اور جب اُس نے ہاتھ پاؤں چلائے تو وہ جوہڑ کی تہہ میں گارے کی دلدل میں پھنس چکی تھی۔

آس پاس کے دیہات سے بہت تیراک آئے لیکن جوہڑ کے گاڑھے اور غلیظ پانی میں ڈبکی لگاتے ہی اُن کا سانس ختم ہو جاتا۔ صرف ایک تیراک نے باہر آ کر بتایا کہ بابُو نیچے گارے میں موجود ہے — اُس نے اُس کا ایک بازو دیکھا تھا۔

تب کسی نے بکّو کا نام لیا۔ وہ بہت چھوٹا تھا لیکن اُس کا سانس بہت لمبا تھا — بکّو نیچے گیا — اتنی دیر نیچے رہا کہ لوگ اُسے نکالنے کے لیے بھی تیاری کرنے لگے۔ وہ باہر آیا تو اُس سے پہلے جوہڑ کی سطح پر گارے کا ایک ڈھیر اُبھرا جس میں سے سفید بازو اور ٹانگیں دکھائی دیتے تھے۔ بابُو کے والدین نے اُسے دو ٹوپے کنک اور ایک ٹوپہ گڑ دیا جو گھر پہنچتے ہی اُس کی ماں نے اپنے قبضے میں لے لیا۔

آج جوہڑ سے باہر اچھّو ترکھان کا بیٹا چراغ دین اُس کا منتظر تھا۔

"تم سے ایک کام ہے بکّو —"

"ہاں جی — آہو جی — بتائیں جی —" اُس نے بڑے اہتمام سے اور ناک سے گارا پونچھا اور پھر جوہڑ کے پانی کے کچھ چھینٹے اپنے بدن پر ڈال کر ایک ہوئی تمتی سے اپنے آپ کو ڈھانپ لیا۔

"تمہارا ساہ کتنا پکّا ہے؟"

"واہ واہ پکّا ہے جی — چھپڑ میں کچھ گرا ہے جی؟"

"نہیں —"

اس "نہیں" نے بکو کو لاجواب کر دیا۔ بھلا جوہڑ کے علاوہ اس کا پکّا سانس کہا آ سکتا تھا۔

"تمہیں ٹیشن پر لے کے جانا ہے تھوڑی دیر کے لیے —"

"ٹیشن پر جی —"

"ہاں —"

"پر ٹیشن پر تو جی —"

"اسی لیے تو لے کر جانا ہے — دیکھتے ہیں تمہارا ساہ کتنی دیر چلتا ہے —"

ٹیشن پر — کامونکی سٹیشن پر دو روز پیشتر ایک ٹرین روکی گئی تھی — اس میں اپنے گھر چھوڑ کر جانے والے تھے۔ اور گھروں میں بوڑھے، بچے، جوان — عو اور مرد سبھی ہوتے ہیں اس ٹرین میں بھی تھے —

لیکن وہ اب نہیں تھے۔

اب پچھلے دو روز سے وہ ٹرین ویران پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور اُس میں بوڑ بچے، جوان — عورتیں اور مرد سبھی گلتے سڑتے بدبُو دے رہے تھے اور تیز دھوپ کچھ جو پلیٹ فارم پر پڑے تھے وہ عجیب مزاحیہ زاویوں میں اکڑے ہوئے تھے — کب کا خشک ہو چکا تھا —

لاشوں کی سڑاند پلیٹ فارم سے اُٹھ کر قصبے کے گھروں کے اندر تک جاتی تھی

"ہاں جی — بتائیں جی" سٹیشن جب نظر آیا تو بکّو نے چراغ دین سے کہا جو ٹا کے اُوپر پگڑی کا پلّو ڈالے اُبکائیاں روکنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

ایک مریل سا کتا اپنے وزن سے کہیں زیادہ کی کوئی شے گھسیٹتا ہوا آ رہا تھا اور

شے کا ایک چھوٹا سا سر اور دو خون آلود آنکھیں بھی تھیں۔

"بکو — پلیٹ فارم پر جہاں بتی گودام کی کیبن ہے ناں؟ — جس کے ساتھ پانی کے مٹ ہوتے تھے — وہاں — وہاں ایک موٹی ہندنی مائی کی لاش ہے۔ اُس نے ایک بڑے گھیر کا سرخ گھگھرا پہنا ہوا ہے — تو جا اور جا کر کسی نہ کسی طرح وہ سرخ گھگھرا اُتار کر لے آ —"

"نہ جی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"اوئے وہ تو مری ہوئی ہے — ڈر کس بات سے لگتا ہے —"

"وہ اُٹھ کر مجھے کھا جائے گی جی — کیا پتہ وہ مری نہ ہو۔"

چراغ دین نے پگڑی کا پلّو اپنے منہ سے ہٹایا اور ہنسنے لگا۔ فوری طور پر ہی شدید بُو نے اُسے یہ پلّو پھر سے ناک اور منہ پر رکھنے پر مجبور کر دیا۔ "مری نہ ہو؟ — سب مرے ہوئے ہیں۔ اُنہوں نے ایک ایک کو بڑے آرام سے قتل کیا تھا — جنہوں نے بھاگنے کی کوشش کی اُن کو اُنہوں نے پلیٹ فارم پر یا پرے لائنوں پر جا پکڑا — یہ موٹی مائی یہاں بھاگ نکلی تھی اسی لیے بتی گودام کے پاس پڑی ہوئی ہے — جا شاباشے۔"

اس نے پہلی بار پلیٹ فارم سے پرے لاہور والے پھاٹک کی طرف دیکھا۔ وہاں سڑک اور ٹرین رُکی ہوئی تھی۔ لیکن اُس میں لوگ تھے اور زندہ تھے۔ بہت عجب بات ہے کہ دونوں ٹرینوں کی کھڑکیوں اور دروازوں میں ویرانی ہے اور کوئی نظر نہیں آتا اور اس کے باوجود لاہور سے آنے والی ٹرین مردہ نہیں لگتی — اور یہ ٹرین بغیر انجن کے جیسے سر کے بغیر ایک لاش... یہ زندہ نہیں لگتی —

"جا بھی بکو — وہاں کوئی نہیں ہے۔"

"پر — تم آپ لے آؤ جی مجھے ڈر لگتا ہے۔" بکو ایک ڈرا کل بچہ نہیں تھا لیکن ان پلیٹ فارم پر پڑی ایک لاش کے پاس جانے سے جھجکتا تھا۔

"میں لا سکتا تو تمہیں ترلے کر کے ساتھ کیوں لاتا — اُدھر بہت بُو ہے۔ سڑاند ہے... میں نے آج سویرے کوشش کی تھی لیکن مجھے اُلٹی آ گئی — تیرا سانس پکا ہے تو سانس روک کر جا جیسے جوہڑ کی تہہ میں جاتا ہے اور گھگھرا اُتار لا — تجھے سو روپیہ ملے گا —"

"سو روپیہ؟" بکو کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں "میں ابھی گیا جی اور ابھی

آیا..." اُس نے عادت کے مطابق اپنی تہمتی اتار کر کندھے پر رکھی۔ ایک گہرا سانس پلیٹ فارم کا رُخ کر لیا۔

لاہور سے آنے والی ٹرین بہت آہستگی سے کامونکی کے پلیٹ فارم میں دا رہی تھی۔ مشاہد نے چوری چھپے دیکھا، وہاں ایک اور ٹرین بھی تھی جو کھڑی دروازوں اور کھڑکیوں میں کچھ لوگ تھے جو عجیب انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کھلے تھے اور اکثر کے کپڑے سرخ رنگ کے تھے۔ ان کے بازو کھڑکیوں سے باہر لٹکے تھے اور اسی لمحے ایک شدید سڑاند نے اُن سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا جو برداشت ہوتی تھی۔ اُس نے ابّا جی کی طرف دیکھا جو اُنہیں باہر مت دیکھو، کا حکم دے کر خ بنے باہر دیکھ رہے تھے اور اُن کی نیلی آنکھوں میں بہت آنسو تھے جو روکنے سے رُ تھے۔

باہر، گذرتی ٹرین میں سے اُس نے دیکھا کہ ایک سیاہ ننگ دھڑنگ بچہ کسی سارے سرخ رنگ کے بھاری کپڑے کو پلیٹ فارم پر گھسیٹتا چلا جا رہا ہے —

اُن کے سروں پر سے مرغابیوں کی ایک ڈار نیچی ہو کر قادر آباد کی طرف اُ تھی — سردیوں کے شروع ہونے کے نشان۔

بیلے کے اندر سے ایک آواز اُن تک آئی، جیسے ایک بھینسا... ڈکراتا ہو۔

مشاہد نے ایک مرتبہ پھر چاچے محمد بخش کا ہاتھ پکڑ کر ہلکی میں ڈبکی لگائی اور د نے اس کے بدن کو چھو سکھایا تھا اور چنگاریاں سی بھر دی تھیں۔ وہ بجھ گئیں اور ٹھنڈک نے اسے آسودہ کر دیا۔

لیکن وہ بُو یہاں بھی موجود تھی — اِس ہلکی میں، جو چناب سے آ رہی تھ کے پانیوں میں بھی موجود تھی —

عشقے دا اِک پلنگ نواڑی — وے اَساں چانناں وِچ ڈاہیا....

لکشمی مینشن کے سہ منزلہ فلیٹوں کی لمبی مستطیل چھت پر مشاہد کی کھلی آنکھ جو آسمان تھا —

گرمیوں کے دوران آپا جی نے اُنہیں کبھی فلیٹ کے اندر کمروں میں سو دیا۔ بے شک پنکھے لگے ہوئے ہیں پر ہوا تو وُہی رہتی ہے ناں بیٹے.. اور پنکھے کے پر

گرم ہو کر جب ساری رات چہرے پر پڑتی ہے تو اُسے جھلسا کر رنگ کالا کر دیتی ہے — ناں بیٹے چھت پر سویا کرو — اتنے سوہنے رنگ ہیں میرے بیٹوں کے — خراب تو نہیں کرنے۔

اور اُن کے بستر ہمیشہ سفید اور شفاف ہوتے۔ آپا جی کے نزدیک رنگ دار بستر اور لباس صرف پناہ گیروں اور گلگڑوں کے ہوتے تھے...

اگر رات چاندنی ہوتی تو چادروں اور کھیسوں میں سے تازہ کپاس کی مہک کچھ زیادہ آنے لگتی۔ وہ اپنی تیکھی ناک کو بار بار تازہ دُھلے ہوئے کھڈی کے سفید کھیس کی کھُردری سطح پر رگڑتا اور گہرے سانسوں کے ساتھ کپاس کی خوشبو کو اپنے اندر اُتارتا۔ ابھی لاہور کا آسمان موجود تھا اور اُسے ڈیزل اور بدبو دار گیسوں اور آلودگی نے اوجھل نہیں کیا تھا اور اسی لیے چاندنی کا پھیلاؤ شہر پر جھکے سارے گنبد کو بھرتا تھا اور روشن کرتا تھا۔

رات چنیں دی چانن تے پُونی ورگاں کاں —

میاں محمد نے وہ کیسی چاندنی دیکھی ہو گی جس میں ایک کوّا داخل ہوا تو کپاس کی پُونی کی طرف سفید ہو گیا۔

اُس نے کروٹ بدل کر مردان کی چارپائی کی جانب دیکھا۔ وہ اب بڑا ہو چکا تھا اس لیے الگ چارپائی پر سوتا تھا۔ مردان گہری نیند میں تھا۔ کچھ دور باجیوں کی چارپائیاں تھیں۔ آپا جی ابھی نیچے تھیں، وہ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد اوپر آتی تھیں۔ اور ابا جی اپنے عملے کے ساتھ ٹُور پر گئے ہوئے تھے۔ اسی لیے اُن کا سفید نواڑی پلنگ اُس کے حصے میں آیا تھا... عشقے دا اِک پلنگ نواڑی۔

اب اُنہیں یاد بھی نہ تھا کہ وہ کبھی گوالمنڈی میں رہا کرتے تھے۔ اُنہیں لکشمی مینشن میں آئے ہوئے ایک طویل عرصہ بیت چکا تھا۔

اس نے سرہانے تلے ہتھیلی کو آگے کیا — کنگن کی گولائی اس کی ہتھیلی میں بریل کی عبارت کی طرح منتقل ہوئی۔ کتنے برس ہو گئے تھے اس کنگن کو — وہ جانتا تھا کہ کتنے برس.. ہر سال یوم آزادی کے موقع پر مال روڈ پر فوج کی پریڈ ہوتی جس میں ٹرک، توپیں اور ٹینک مال کی تارکول کا ستیاناس کرتے ہوئے دندناتے ہوئے ایک گہری گرج کی تسلی کے ساتھ گذرتے کہ وہ سارا ہجوم جو کوٹھوں اور ممٹیوں پر کھڑا اس پریڈ کا منتظر ہوتا اُن کے لیے

یہ تسلی دل کو خوش کرتی تھی کہ ہماری اپنی فوج ہے اور اس میں ٹینک بھی ہیں جن
گڑگڑاہٹ سے دل دہلتے ہیں اور یہ ملک تاقیامت قائم رہے گا... ساری مال روڈ سج جا
صبح سویرے اُن تمام لوگوں کے گھروں میں مہمان آنے لگتے جن کی چھتوں اور کھڑکیوں
مال روڈ پر گذرتی پریڈ کا نظارہ ہو سکتا تھا... اُن کی چھت پر بھی خوب ہجوم ہوتا اور آپا
کسی بھی مہمان کو سوڈا واٹر پلائے بغیر جانے نہ دیتیں اور اگر پریڈ دیر سے ختم ہوتی تو فو
طور پر چاولوں کا دیگچہ چڑھا دیا جاتا۔

چودہ اگست کو گذرے ابھی چند روز ہوئے تھے اور ابھی تک اُنہوں نے پاک
پرچم اُتار کر صندوق میں نہیں رکھا تھا۔

مشاہد کا خیال تھا کہ مردان گہری نیند میں ہے لیکن اُس کی آنکھیں کھلی تھیں ا
وہ جھنڈے کو تکے جا رہا تھا۔ چودہ اگست کی پریڈ ابھی تک اُس کے اندر ہو رہی تھی۔ ٹھ
ٹھپ کرتے ہوئے بھاری بوٹ اور گڑگڑاتے ہوئے ٹینک — ملک کو بچانے والے
اگر فوجی بن جاؤں تو کتنا مزہ آئے — یہاں سے، آپا جی مجھے بھی پریڈ کرتے ہوئے دیکھ
اور سارے مہمانوں کو بار بار بتائیں... یہ میرا مردان ہے.. ہاں ہاں سارے ایک جیسے
ہیں لیکن وہ جو دوسری قطار میں ہے — کتنا مزہ آئے...

کنگن ابھی تک خفیہ چلا آ رہا تھا۔ بعض دنوں میں وہ بہت بے چین ہوتا کہ کہ
یہ جُرم تو نہیں، کہیں یہ لوٹ مار کا مال تو نہیں۔ اُس کے ابا جی ہمیشہ کہتے تھے کہ جس نے
نے لوٹ مار کے مال کو ہاتھ لگایا ہے وہ اور اُس کی آل اولاد ہمیشہ حرام کھاتی رہے گی
یہی لوگ ہوں گے جو بالآخر پاکستان کو کھا جائیں گے — مشاہد پاکستان کو بالکل نہیں کھ
چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ کنگن کو بھی اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

آج رات بھی ریگل چوک کے پار "سٹینڈرڈز" کے اوپن ایئر ریستوران
موسیقی اور تماشائیوں کا ہلکا شور اُٹھتا تھا اور شہر لاہور کی اکلوتی اور من پسند ڈانسر اینجلا
تھی۔

بہت برس بعد آج اسے لاہور کا وہ آسمان یاد آیا تھا جو شاہ عالمی کے جلنے
کی سرخی کی طرح دہکتا تھا۔ جس میں عمارتوں اور گھروں کے گرنے کی ملفوف سی گڑ
سنائی دیتی تھی اور جلے ہوئے کاغذ سیاہ پرکٹے پرندوں کی طرح ڈولتے ہوئے آتے
اُس کے سفید کھیس کو سیاہ کرتے تھے — ریگل سینما کے میٹنی شو میں، اندھیرے

سکرین پر اُس نے اُسی آسمان کو ایک مرتبہ پھر دیکھا تھا — ویسے ہی سرخی میں نہایا ہوا اور سرخی بھی ایسی جو جامد نہ تھی لرزتی تھی اور یہاں بھی عمارتیں جن کو آگ لگائی گئی تھی گر رہی تھیں اور زمین بوس ہونے پر بجھے بجھے دھماکوں کی آواز آتی تھی — پورے ہال میں وہ واحد تماشائی تھا جو اس عظیم الشان منظر سے لطف اندوز ہونے کی بجائے کپکپا رہا تھا اور ایک چھوٹے سے بچے کی طرح ڈر رہا تھا اور آج بھی وہ یہ منظر ختم ہونے سے پیشتر ہال سے باہر آ گیا تھا۔ آج وہ تیسری مرتبہ یہ فلم دیکھنے گیا تھا۔ اُسے اتنی زیادہ آزادی تو نہیں دی گئی تھی کہ وہ مسلسل ایک ہی فلم دیکھتا چلا جائے لیکن مشاہد ماں باپ کی جانب سے دی ہوئی تھوڑی سی ڈھیل کو ذرا اور فاصلے تک لے جاتا — گرمیوں میں خاص طور پر کھانے کے بعد بیٹھک کے دروازے اور کھڑکی کو خس کی چکوں سے ڈھانک دیا جاتا۔ ابّا جی کئی بار پوری دوپہر اُن پر پانی کا چھڑکاؤ کرتے رہتے اور کبھی فوراً ہی بور ہو کر سو جاتے اور جب بھی وہ سوتے مشاہد بہت آسانی کے ساتھ فلیٹ کے عین سامنے واقع ریگل سینما میں مٹنی دیکھ کر اطمینان سے واپس آ جاتا —

آج اُس نے "گاؤ واڈس" کا مٹنی شو تیسری مرتبہ دیکھا تھا اور تیسری مرتبہ آگ منظر کے اختتام سے پہلے اُٹھ آیا تھا۔

یہ روم کے جلنے کا منظر تھا۔

پیٹر اسٹی نوف رومن شہنشاہ نیرو کے کردار میں — اور روم جل رہا ہے اور وہ ساز بجا رہا ہے۔ اور روم کا آسمان، لاہور کا آسمان تھا — جب شاہ عالمی جل رہا تھا... میں مشابہت بہت تھی — کئی بار مشاہد نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا لیکن پردۂ سکرین جلتے ہوئے شہر سے راکھ نہیں اُٹھا کرتی۔

لکشمی مینشن اب وہ نہیں رہا تھا جو کہ پہلے تھا۔

اس کی بوسیدہ اینٹوں، گرد آلود گراؤنڈ اور بالکونیوں میں بیٹھی لڑکیوں میں تبدیلی آ گئی تھی۔ اُس پر جو وقت گذرا تھا وہ اُسے تبدیل کر گیا تھا۔ فلیٹوں کی سیڑھیوں کے تھڑوں پر لڑکے کم بیٹھتے تھے۔ بیٹھتے تھے تو ذرا شرمندہ ہو کر اور اُس آزادی سے بالکونیوں کی طرف نہیں دیکھتے تھے جیسے دیکھا کرتے تھے۔ جین پیٹرز، ایوا گارڈنر اور گریگوری پیک کی فلموں کے البم... ہاؤ ڈی مسٹر... کم آن ڈرا — اور چاندنی راتوں کے گانے جب

بالکونیوں سے گجرے گرتے تھے... یہ سب کچھ ماضی ہو رہا تھا — تمام مسکیٹرز بچپ
نکل کر جوانی کی حدّت میں داخل ہو رہے تھے اور انہیں اپنے بدلتے جسموں پر اع
تھا۔ مشاہد اور کمال گورنمنٹ کالج میں جا چکے تھے اور وہ اب سنجیدہ اور بالغ نظر آ
کوشش کرتے تھے۔

سمیعہ پہلے سے زیادہ بھر چکی تھی اور کوٹھا ملاقاتوں کے دوران اُس کے گورے
میں سے ایک وحشی مہک مشاہد کے پپوٹوں کو بھاری کر دیتی اور وہ بھولپن میں کبھی
سکا کہ یہ مہک سمیعہ کے اُوپر سے آ رہی ہے، نیچے سے آ رہی ہے یا درمیان میں
رہی ہے۔

یہ مہک اُس کا پیچھا کرتی — صفدر میر انگریزی ادب پڑھاتے ہوئے جوش
جاتے اور شیکسپیئر کی لائنوں پر جھومتے ہوئے کلاس روم سے باہر برآمدے میں چلے ج
اور اُنہیں علم نہ ہوتا کہ وہ کہاں ہیں... اور سمیعہ کی مہک، گیلی اور گرم شیکسپیئر کی
سے چپک جاتی۔ قیوم نظر کی گرجدار آواز اوپن ایئر تھیٹر میں گونجتی — وہ میرا
کے اشعار کی تصویریں بناتے تو اُن تصویروں میں سمیعہ کی گولائیاں اُبھرنے لگتیں...
کے ساتھ کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ "کچھ" کیسے کیا جاتا ہے —
کے نہیں بدن کی بے تابی کے بے بس کر دینے والے دن تھے —

ہاں لکشمی مینشن اب وہ نہیں رہا تھا جو کہ پہلے تھا.. اس لیے کہ منٹو صاحب
نہیں تھے.. اُن کے ساتھ آخری واردات "نالی ایپی سوڈ" کہلاتی تھی اور اس
مینشن کراؤڈ ملوّث تھا۔

مینشن کراؤڈ میں روایت تھی کہ جب کسی بھی ممبر کو کوئی بھی عجیب سی
دستیاب ہوتی تو اُسے سب کے سامنے پیش کر کے یہ سوچا جاتا کہ اس کے ساتھ کی
ہے — کس قسم کی واردات ہو سکتی ہے۔ رتی پے ماسٹر کو کہیں سائیکل کی آ
ٹیوب ہاتھ لگ گئی اور اِسے ایک تھڑے پر رکھ کر پورے کراؤڈ نے غور وخوض کیا
کیا مصرف ہو سکتا ہے۔ چنانچہ کراؤڈ کے جو بہترین دماغ تھے اُنہوں نے فیصلہ کیا
درمیان میں سے کاٹ کر سیدھا کیا جائے۔ اس کے بعد ایک سرے پر گانٹھ لگا کر
سرے سے اس میں خوب پانی بھرا جائے — یہاں تک تو صورت حال واضح تھی
کے بعد کیا کیا جائے — یہ واضح نہ تھا — اس گتھی کو حسب معمول تاج نے

و صاحب کے ایک بیڈ روم کی کھڑکیاں پچھلی گلی میں کھلتی تھیں لیکن اُنہیں بالکل نہیں
ولا جاتا تھا اور باقاعدہ مقفل رکھا جاتا تھا۔ اُن دنوں کمروں کے فرش سُرخ اینٹوں کے
تے تھے اور اُنہیں باقاعدگی سے دھویا جاتا تھا اور اُن کی سُرخی نکھرتی چلی جاتی تھی۔ پانی
ے نکاس کے لیے ایک دو انچ قطر کا سُوراخ بھی رکھا جاتا تھا — منٹو صاحب کے متذکرہ
روم کے فرش کی سطح پر ایک ایسا ہی سوراخ تھا جو پچھلی گلی میں کھلتا تھا۔ ایک شب اُس
ر ٹیوب میں پانی بھرا گیا اور پھر اُسے دھیرے دھیرے زور لگا کر اُس سُوراخ کے راستے
و صاحب کے بیڈ روم کے اندر تک لے جایا گیا۔ اب پوزیشن کچھ یوں تھی کہ پانی سے
ری ہوئی ٹیوب کا وہ سرا جس پر گانٹھ لگی ہے بیڈ روم کے تقریباً درمیان میں پہنچ چکا ہے
ر دوسرا سرا تاج کے ہاتھ میں ہے۔ اور تاج صاحب ٹیوب کو مُٹھیاں بھرتے ہوئے پانی کا
شر اتنا بڑھا دیتے ہیں کہ دوسرے سرے کی گانٹھ کُھل جاتی ہے اور سارا پانی منٹو صاحب
ے بیڈ رُوم میں.. اس واردات کے بعد ٹیوب کھینچ لی گئی اور سب خواتین و حضرات اپنے
پنے گھروں کو لوٹ گئے اور یہ واردات تقریباً ہر رات دوہرائی جاتی —

ایک روز کیا دیکھتے ہیں کہ صفیہ آپا نے فلیٹ کے آگے زردے کی دیگ چڑھا
ھی ہے اور اہل مینشن کو بتا رہی ہیں کہ ہائے میں نے جو صبح اٹھ کر دیکھا تو فرش پر پانی
پانی.. میں نے سوچا منٹو صاحب نے کر دیا ہے — اُن کو جھڑکا تو کہنے لگے صفیہ مجھ سے
م لے لو میں نے یہ نہیں کیا — خیر میں نے وہاں بوری پھروائی اور خشک کیا — لیکن
ا صبح پھر فرش پر پانی — کھڑکیاں ساری بند۔ دروازوں میں بھی چٹخنیاں چڑھی ہوئیں پھر
رش خشک کر دیا اور اگلی صبح.... تب کسی نے بتایا کہ صفیہ بند کمرے میں کوئی آتا جاتا
ں۔ راستہ کوئی نہیں تو بس جلدی سے زردے کی دیگ چڑھا.. چنوں بھوتوں کی کارستانی
ے — میرا تو "تراہ" نکل گیا.... مسجد میں کہہ کر آئی ہوں کہ قرآن ختم کریں.. دیگ بھی
ھائی ہے — اللہ رحم کرے...

مینشن کراؤڈ نے اس روز جی بھر کے زردہ کھایا اور اس تھیسس سے مکمل اتفاق کیا
ہ یہ چنوں بھوتوں کی کارستانی ہے۔

اُس رات ایک مرتبہ پھر جب پانی سے بھری ہوئی ٹیوب منٹو صاحب کے بیڈ رُوم
ں داخل کی گئی اور اُسے پچکایا جا رہا تھا تاکہ دوسرے سرے کی گانٹھ کُھل جائے تو محسوس
ا کہ دوسری جانب سے بھی کسی نے اُسے مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے۔ اب اِدھر سے

زور لگا رہا ہے اور ادھر سے پتہ نہیں کون زور لگا رہا ہے اور تب منٹو صاحب کی آو
گرج کے ساتھ آئی — اوئے جن بھوتو تمہاری میں ماں کی... اور تمام جن بھوت
ہوئے اپنے گھروں کو سرپٹ بھاگے اور اپنی ماؤں کی گودوں میں جا دبکے — اور ک
تک اپنے گھروں سے باہر آنے کی جرأت نہ کی۔

منٹو صاحب کو مینشن کراؤڈ کی یہ شرارت زیادہ پسند نہ آئی اور وہ اُن سے
عرصہ ناراض رہے اور جو کبھی کوئی سلام کرنے کی جرأت کر لیتا تو اُسے "تیری بہ
بھوت کی..." کی ڈانٹ پڑ جاتی۔ پھر مینشن کراؤڈ نے عالمی اولمپک مقابلوں کی سطح
"مینشن اولمپک" کا انعقاد کیا اور منٹو صاحب کی منت سماجت کر کے اُنہیں مہمان خص
رُتبہ دیا گیا۔ اُن کے بیٹھنے کے لیے تین چار میزوں کو اوپر نیچے رکھ کر ایک بلند پلیٹ
سا بنایا گیا۔ منٹو صاحب کو بڑی مشکل سے اس کے اوپر بٹھایا گیا اور چار لڑکوں نے
سے نچلی میز کے پائے تھامے رکھے تاکہ یہ بلند مچان نیچے نہ آ جائے۔ منٹو صاحب جو
تھے اب راضی ہو گئے اور جب تقریر کرنے کے لیے اُٹھے تو ڈولنے لگے اور مچان
نیچے آنے کو تھے کہ کراؤڈ نے اُنہیں راستے میں ہی دبوچ لیا — لیکن ان وارداتوں
بہت دن ہو گئے تھے... اب تو بچوں نے بھی اُچھل اُچھل کر بیڈ منٹن کھیلنا چھوڑ دیا تھا
کو پتلون سلانے کے لیے اپنا خاندانی درزی چھوڑ کر ایک اور درزی تلاش کرنا پڑا
خاندانی درزی صرف نیکریں بنانے میں ماہر تھا اور اگر پتلون بناتا تو بس نیکر کو ذرا لمبا
— اور تاج اب فیشن ایبل ہو چکا تھا... مُجّی کے فلیٹ کے قریب کوئی ملک معراج
چکے تھے۔ ادھر جاوید اثر والد صاحب کی الماری میں سے ایک ایسی دوائی اکثر نکال کر
جس سے سر گھومتا تھا اور جو بہت کڑوی تھی — اور جسے برانڈی کہتے تھے — اثر
دوسری شادی کر چکے تھے اور ایک رات مینشن میں ایمبولینس کے ہوٹر کی آواز
کو جگا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اثر صاحب اور اُن کی دوسری بیگم نے دوائی زیادہ پی لی اور
بے ہوش ہو گئے —

منٹو صاحب بھی اب بہت بیمار رہتے تھے۔ لیکن اُنہیں روزی کمانے
روزانہ ناشروں کے چکر لگانے پڑتے تھے اور جب کبھی اُن کا تانگہ مینشن میں داخل
مشاہد آگے ہو کر انہیں سلام کرتا اور وہ اس کے کندھے کا سہارا لے کر گھر کی جا
لگتے — "مشاہد بہت اچھا بچہ ہے —" وہ کہتے اور پھر فوراً معذرت کرنے لگتے

نہیں.. بچہ کہاں ہے اب تو جوان ہو گیا ہے۔ پتلون پہنتا ہے۔"

لیکن ہر روز وہ مشاہد کے کندھے پر بوجھ زیادہ ڈالتے اور اُن کی ٹانگوں میں نقاہت اور لرزش زیادہ ہوتی۔

اُن کے فلیٹ کے عین سامنے گراؤنڈ میں کیکر کا ایک سوکھا ہوا تنا تھا۔ ایک واردات یہ بھی ہوتی کہ اُس تنے پر مٹی کا تیل چھڑک کر اُسے آگ لگانے کی کوشش کی جاتی۔ آگ تو خیر کیا لگتی وہ سلگنے لگتا اور اکثر ہوا کا رُخ ایسا ہوتا کہ سارا دھواں منٹو صاحب کی کھڑکیوں کی طرف جاتا اور وہ باہر آ کر کہتے "اوئے تم نے میرے اندر سے جن نکالنے ہیں؟"

آخری بار اُس نے منٹو صاحب کو اُس تنے کے پاس دیکھا۔

وہ کھانس رہے تھے اور اُس گھریلو ملازم کو ہدایات دے رہے تھے جو کیکر کے تنے کو ایک کدال کی مدد سے زمین میں سے نکال رہا تھا۔

مشاہد، مردان کی اُنگلی تھامے آپا جی کے لیے دہی لینے بیڈن روڈ جا رہا تھا...

"مشاہد ـــ" اُنہوں نے بمشکل آواز دی۔

مشاہد تو خود بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے وہ فوراً اُن کے پاس پہنچ گیا۔

"تم اچھے بچے ہو مشاہد ـــ" اُنہوں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، جیسے تانگے سے اُترے ہوں اور سہارا لینا چاہتے ہوں۔ "کیکر کا یہ سوکھا ہوا تنا بدنما لگتا تھا.. اور یوں بھی...." وہ بری طرح کھانسنے لگے۔ اُن کی کھانسی کی آواز نے مردان کو ڈرا دیا اور اُس نے مشاہد کی اُنگلی کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اُنہوں نے جلد ہی سانس پر قابو پا لیا۔

"آپا جی کے لیے دہی لینے جا رہا ہوں جی ـــ"

"شاباش، تم اچھے بچے ہو مشاہد ـــ"

ملازم نے تنے کے گرد کی زمین کو کدال سے نرم کر لیا تھا اور اب وہ اُسے جھٹکا مار ہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم بھی زور لگاؤ ـــ"

مشاہد نے دہی والا کٹورہ زمین پر رکھ دیا اور تنے کو دھکیلنے لگا ـــ تھوڑی ہی دیر میں وہ زمین پر تھا۔ اُس کا اوپر والا حصہ سیاہ ہو چکا تھا۔